ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

اختر رضا سلیمی کے ناول "جندر" میں دیہی ترکِ سکونت کے مباحث

A Discussion of Rural Exodus in Akhtar Raza Salimi's Novel Jandar

سائرہ صدف
لیکچرار اُردو، اسپائر کالج، ملتان
ڈاکٹر عظمیٰ شوکت
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج اصغر مال، راولپنڈی

Abstract
Akhtar Raza Saleemi is famous poet, fiction writer and editor. He started his literary career as poet but later he got popularity as a fiction writer as well. He has written three novels. His novel JINDER predicted changes in village life. Wali Muhammad is the protagonist of the novel.. In JINDER Akhtar Raza Saleemi showed the gap between the old generation and new one. New generation started leaving villages for better livelihood and high standard life. In this article, attempt has been made to discuss village life and its multihull aspects with particular references from the novel JINDER-

Keywords: Abundance, Livelihood, Civilization, Facilitation, Generation

کلیدی الفاظ: ترک، روزگار، تہذیب، سہولت، نسل

آج اردو ناول ڈیڑھ صدی سے زائد کا سفر طے کر چکا ہے۔ اس سفر کے مختلف ادوار میں اردو ناول بہت سے تجربات سے گزرا ہے۔ جہاں اسلوب، تکنیک اور ہیئت کے حوالے سے تجربات ہوئے وہیں اردو ناول نے ان موضوعات کو بھی جگہ دی جو ہمارے سماجی مسائل کی گھمبیرتا کو بڑھا رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کے ناول نے جدید ٹیکنالوجی، ماحولیاتی تغیر اور عالمگیریت کے تحت پنپنے والی زندگی کی گزران کو اس طرح موضوع بنایا ہے کہ ہم اس اردو ناول کو عالمی سطح پر لکھے جانے والے ناول کا ہم پلہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آج کے ناول میں ہمیں وہ مسائل بھی زیرِ بحث نظر آتے ہیں جو شاید عمومی طور پر اتنے اہم نہیں سمجھے جاتے یا یہ کہ وہ مسائل نہیں ہیں جو اچانک سے پیدا ہو گئے ہیں۔ ایسا ہی ایک سماجی، ثقافتی اور اقدار سے جڑا مسئلہ دیہی ترکِ سکونت ہے۔ اکیسویں صدی کے چند اہم اردو ناولوں میں سے اس مسئلہ کو ہمارا مرکزی سماجی مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

قدیم ہندوستان سے آج کے پاکستان تک آبادی کا ایک بڑا حصہ دیہی آبادی پر مشتمل رہا ہے۔ دیہات اور شہروں کی ثقافت، اقدار، رسوم و رواج اور معیشت ایک دوسرے سے مختلف رہی ہیں۔ آج بھی ایک اندازے کے مطابق پاکستانی آبادی کا ستر فیصد سے زائد حصہ دیہی آبادی پر مشتمل ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے انسانی زندگی میں بڑے بدلاؤ آئے جس کی وجہ سے برصغیر کا وہ سماج بھی جو کئی صدیوں سے ایک ہی ڈگر پر چل رہا تھا اچانک ایک جست بھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے دیہاتوں سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد شہروں کی طرف ہجرت کرنے لگی اور دیہی اور شہری زندگی پر اس کے شدید اثرات مرتب ہوئے۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی سے دیہی ترک سکونت کا آغاز ہوا اور اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اختتام تک اس عمل نے شہری اور دیہی زندگی کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ دیہاتوں سے شہروں کی طرف اس ہجرت کے بہت سے اسباب ہیں جن میں سے چند بنیادی وجوہات درج ذیل ہیں:

اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی پاکستان کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا جس کی وجہ سے بہت سے مسائل نے جنم لیا ان میں ایک اہم مسئلہ معاشی دباؤ رہا۔ اس سے پہلے دیہاتوں میں اگر گھر میں سے کوئی ایک فرد بھی کمانے والا تھا تو سارا گھر بیٹھ کر کھاتا تھا۔ اب صورتحال بدل چکی تھی جس کی وجہ سے لوگ روزگار کی تلاش میں شہروں کی طرف آئے تو دیہات ویران ہو گئے۔ ان لوگوں کی شہر آمد سے شہری آبادی میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا اور مقامی شہریوں اور نئے آنے والے دیہاتیوں کے درمیان ایک اجنبیت کا رشتہ قائم ہوا۔

شہروں میں میں روزگار حاصل کرنے کے لیے دیہات کے لوگوں نے دیہی سکونت کو ترک کیا اور عارضی طور پر شہروں میں مقیم ہو گئے۔ کچھ لوگوں کو شہروں میں مستقل ملازمت مل گئی تو وہ وہیں آباد ہو گئے۔ دیہاتوں میں جدید تعلیمی سہولیات کی ہمیشہ سے کمی رہی ہے۔ دیہاتوں میں جو لوگ خوشحال تھے انہوں نے اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دیہی سکونت کو ترک کیا اور شہری رہائش کو اپنا لیا۔ یوں بچوں کے ساتھ والدین بھی شہروں میں آ کر آباد ہو گئے۔ عالمگیریت کے اثرات ہمارے سماج پر گہرے ہوئے تو دیہات کے لوگوں نے بھی بہتر طرزِ زندگی اپنانے کی غرض سے شہروں کا رخ کیا۔ اس

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

کے علاوہ بجلی کی لوڈشیڈنگ، خوراک کا بحران، سفری سہولیات کی کمی، گاؤں کی قدیم توہماتی زندگی، فرسودہ رسومات اور خاندانی جھگڑوں کی بنا پر بھی بہت سے لوگ دیہاتوں سے مستقل طور پر شہروں میں آکر آباد ہو گئے۔

اس دیہی ترکِ سکونت کے اثرات دیہات اور شہر دونوں پر یکساں طور پر مرتب ہوئے۔ جو لوگ دیہاتوں سے شہروں میں آئے وہ مکمل طور پر شہری رنگ اور طرزِ زندگی کو نہیں اپنا سکے۔ شہر میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے لباس، حلیے، اندازِ گفتگو اور سوچ میں دیہاتی ہی رہے بلکہ شہری طرزِ زندگی کو بے دلی اور تعصب کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انہیں ہر وقت دیہات اور وہاں کی اقدار یاد آنے لگیں اور یوں ان کے ہاں ہر صورت میں ایک موازنہ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ شہر آنے کے بعد کچھ عرصہ تک یہ لوگ دیہات سے جڑے رہے اور دیہات میں ہر غم اور خوشی کے موقع پر شریک ہوتے رہے مگر آہستہ آہستہ یہ تعلق کمزور ہوتا چلا گیا۔ دیہات سے شہر آنے والے لوگ اب نہ مکمل طور پر شہری رہے اور نہ دیہاتی۔ وہ دیہات میں جاتے ہیں تو وہاں کی اقدار کو فرسودہ قرار دیتے ہیں۔ شریک رشتہ داروں پر رعب قائم رکھنے کے لیے خود کو شہری ثابت کرتے ہیں اور شہروں میں یہ شہریوں کے طور طریقوں کو غلط سمجھتے ہیں۔ یوں یہ لوگ شہروں میں آکر ایک خود اذیتی کیفیت میں مبتلا ہو گئے اور آہستہ آہستہ ان میں اجنبیت، تنہائی اور دوہرے معیارات نے گھر کر لیا اور یوں ان کی فطری صلاحیتیں ختم ہو کر رہ گئیں۔ ان لوگوں کے لیے وہ مصنوعی تفاخر ہی اصل زندگی بن گیا جس کا نقاب اوڑھے یہ لوگ دوسری زندگی بسر کر رہے تھے۔

دوسری طرف دیہاتوں میں بھی بڑے پیمانے پر تبدیلی آئی اور اب دیہات ویسے نہیں رہے۔ وہاں پختہ گھر اور پکی سڑکیں اور جدید ٹیکنالوجی آ چکی ہے۔ دیہات کے لوگ میلے، کھیلوں، تہوار اور عرس سے خوشی کشید کرتے تھے جہاں مقامی کھیل اور ہنرمندی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ دیہاتوں میں قدیم اقدار دم توڑ رہی ہیں وہاں پر پروان چڑھنے والی نئی نسل شہر کی زندگی کو آئیڈیل تصور کرتی ہے اور دیہات اور اس کی زندگی سے متنفر ہونے لگی ہے۔ دیہی زندگی میں زراعت اور کسان کو مرکزی حیثیت رہی ہے۔ لوہار، کمہار، جولاہا، تیلی، ماشکی، ہجام اور ترکھان کے پیشے کسان کے ساتھ جڑے تھے اور اسی کے معاون تھے۔ کسان کی فصل آنے پر ان سب کو حصہ ملتا تھا۔ ڈاکٹر طارق مجید نے دیہات کی تعریف یوں کی ہے:

> ”جغرافیہ کی رُو سے دیہات اس علاقے یا آبادی کو کہتے ہیں جو آبادی اپنے کھیتوں کے ارد گرد پھیل جاتی ہے یا اپنی فصل کی حفاظت کے لیے قریبی گھروں میں رہنے لگتی ہے۔“(۱)

دیہی ترکِ سکونت سے دیہاتوں کی اجتماعی زندگی شدید متاثر ہوئی ہے۔ لوگ مل جل کر ایک دوسرے کے کام کرتے تھے جس میں فصل کی بوائی کٹائی، برسات سے اپنے گھروں اور چھتوں کی مرمت خاص طور پر شامل تھے۔ سرِشام کسی چوپال میں بزرگوں کی محفل میں قصہ کہانی اور لوگ گیت شامل ہوتے۔ جدید ٹیکنالوجی کے آنے سے دیہاتوں میں وہ کام جو بہت سے لوگ مل کر ہفتوں میں سرانجام دیتے تھے ٹریکٹر اور تھریشر مشین سے چند گھنٹوں میں ہونے لگے اور یوں گاؤں کی اجتماعی زندگی بکھرنے لگی اور لوگوں کی ہجرت سے گاؤں میں اب وہ اشتراک، میلے، تہوار اور مقامی کھیل ختم ہو گئے ہیں۔

> ”ناول نگار اپنے ماحول کو دو طرح سے سامنے لاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ سماج کے نقشے بازاروں، گلیوں، سڑکوں وغیرہ کی حالت پیش کرتا ہے دوسرا یہ کہ وہ مناظر قدرت کو پیش کرتا ہے جن میں جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں وغیرہ کی تصویریں ہمارے سامنے لائی جاتی ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں ناول نگار اپنی قوتِ واقعہ نگاری دکھاتا ہے۔ اچھے ناول میں یہ قوت نمایاں ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت، فسادات اور دوسری جنگ عظیم کے اثرات کو ناولوں اور افسانوں کا موضوع بنایا گیا۔ دیہاتی لوگوں پر ہجرت کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کو بھی ناولوں میں مقام دیا گیا ہے۔“(۲)

جدید اردو ناول نے روایتی موضوعات سے بڑھ کر پاکستانی سماج کے ان موضوعات کو لیا ہے جن کی وجہ سے بڑی سماجی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ یہی جدید ناول کا اختصاص ہے کہ وہ کسی موضوع کو محض سادگی سے یک رخا نہیں رہنے دیتا۔

> ”ناول محض تفریح یا وقت گزاری کا ذریعہ نہیں رہ گیا بلکہ اس میں سنجیدہ مضامین اور وقیع موضوعات کے لیے بھی گنجائش پیدا ہوئی۔ عام انسانی زندگی کے نشیب و فراز، اور خوابوں و خوشیوں یا محرومیوں و ناکامیوں کی عکاسی کے علاوہ معاشرے کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی پہلوؤں کو بھی ناول کے دائرے میں

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

شامل کیا گیا۔ اس طرح نہ صرف ناول اپنے وسیع تر دائرے میں انسانی احساسات اور جذبات کا ترجمان ہو گیا بلکہ اس میں ماحول کے جزئیات اور خارجی فطرت کی کیفیات بھی بدرجہ اتم سمو گئے۔"(۳)

یوں اردو ناول نے ہمیں ہمارے سماج کی وہ کہانیاں سنائیں جو ہمارے سامنے تو تھیں لیکن ان کی حساسیت کو ہم نے اس طرح پہلے محسوس نہیں کیا تھا۔ دیہی سماج کے مسائل سے اس ملک کی ایک پوری نسل متاثر ہوئی ہے اور وہ دیہات جو رونق اور خوشی کی ثقافت کے آئینہ دار تھے وہاں سے جانے والوں کے لیے تابوت بن گئے۔ مائیں اپنے بچوں کو خیریت سے لوٹ آنے کی دعائیں کرتے کرتے دنیا سے چلی گئیں لیکن پردیسی بیٹے لوٹ کر نہیں آئے۔ ان کے حصے کا دکھ اور کرب بھی پیچھے رہ جانے والے لوگوں نے برداشت کیا اور اپنی ہر خوشی میں ان کو یاد کر کے دکھی ہو گئے۔

دیہات اردو فکشن کا ایک بڑا موضوع رہا ہے۔ خاص طور پر اگر ہم اکیسویں صدی کے ناول کی بات کریں تو ہمیں کئی ایسے ناول نگار نظر آتے ہیں جن کے ہاں مرکزی موضوع دیہات ہے اور یہاں کے لوگوں، ان کے رہن سہن اور ان کے ذاتی اور اجتماعی مسائل کو انہوں نے ناول میں موضوع بنایا ہے۔ اختر رضا سلیمی ایسے ہی ایک ناول نگار ہیں جن کے دو ناول "جندر" اور "جاگے ہیں خواب میں" دیہات کی زندگی کو موضوع بناتے ہیں اور خاص طور پر ان کے ناولوں کے کردار ترکِ سکونت کرتے ہیں۔ دیہات سے شہر آتے ہیں لیکن کیا وہ شہر میں آکر آباد ہونے کے بعد اپنی زندگی سے دیہات کو نکال سکے یا یہاں خوش رہ سکے۔ یہ ناول اسی صورتحال کو موضوع بناتے ہیں۔

اختر رضا سلیمی ایک ہمہ جہت ادیب ہیں۔ وہ شاعری، فکشن، تنقید اور ادارت میں اپنی صلاحیتوں کو آزما رہے ہیں۔ گزشتہ عرصہ سے انہوں نے فکشن کی طرف اپنی توجہ کو مرکوز کیا ہے اور دو بہت عمدہ ناول اردو ادب کو دیے ہیں۔ کوئی بھی ادیب فطری طور پر کسی صنف کو اپنے اظہار کے لیے ضروری سمجھا ہے تو ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد اس کی ترجیحات بدل جائیں تو ہمیں یہی صورت اختر رضا سلیمی کے ہاں نظر آتی ہے۔ وہ شاعری سے ناول کی طرف آئے۔

"میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ میں صرف ناول میں ہی اپنے آپ کو پوری طرح لکھ پاتا ہوں اور میرا کیتھارسس جس طرح ناول لکھتے ہوئے ہوا، شاعری لکھتے ہوئے نہیں ہو سکا تھا۔"(۴)

اختر رضا سلیمی کا ناول "جندر" ایک ایسا ناول ہے جس میں ایسے کردار ملتے ہیں جو دیہی زندگی کو چھوڑ کر شہری زندگی اپناتے ہیں۔ شہری زندگی کہیں نہ کہیں عالمگیریت کی علامت ہے کہ ایک شہر میں ملکوں ملکوں اور علاقوں کے لوگ ملتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مقامیت علاقائی ثقافت اور کسی خاص خطے کے لوگوں کی ذہنی، زمینی اور لسانی صورتحال کو عیاں کرتی ہے۔ اختر رضا سلیمی کا ناول جندر مقامیت کا استعارہ ہے۔ محمود احمد قاضی لکھتے ہیں:

"اختر رضا سلیمی کی لکھت میں ایک عمدہ ہنر پوشیدہ ہے کہ وہ دور کی کوڑی نہیں لاتا۔ وہ اپنے لوگوں اور اپنے وسیب کی بات کرتا ہے۔ جنگل، پہاڑ، ندیاں، سخت کرخت زندگی، کانٹے دار جھاڑیاں، مچھلیاں، مرن جیون، یہ سب کچھ ان کا اپنا ہے۔"(۵)

اختر رضا سلیمی نے ان عناصر کو عمدگی سے ناول کا حصہ بنایا ہے۔ وہ کرداروں کو ان کے جغرافیے کے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وہ اپنے ناول "جندر" میں اس سارے دیہاتی ماحول کو سامنے لاتے ہیں جس کو چھوڑ دینا آسان نہیں ہے۔ عمومی طور پر دیہات کی زندگی پر وہی لوگ لکھ سکتے ہیں جن کا تجربہ دیہات میں رہنے کا ہوتا ہے۔ دیہات کی زندگی فطرت کے قریب ہے۔ اس میں مصنوعیت نہیں ہے۔ وہاں ہر چیز خالص ہے۔ یوں کوئی کردار جب ایسی فضا میں پروان چڑھتا ہے تو پھر اس کے لیے اسے چھوڑ دینا کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔ وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں جا کر آباد ہو جائے تو اس کے اندر سے وہ بُو باس کبھی نہیں جاتی۔ وہ دنیا کے کسی دوسرے خطے میں بھی رہے تو وہاں پر بھی وہ اسی مہک کو محسوس کرتا ہے۔ یہی صورتحال ہمیں "جندر" میں محسوس ہوتی ہے۔ اس ناول کی اس قدامت اور دیہی معاشرت کے حوالے سے دیکھیے۔

"جندر المیاتی رنگ اور کیفیت میں ڈوبا ہوا ایسا ناول ہے جس نے مٹتی ہوئی مقامیت کو دل آویز بنا کر پیش کیا ہے۔ جندوئی دراصل اس مقامیت کی آخری نشانیوں میں سے ہے جو مٹنے کے قریب ہیں۔ اس ناول نے اس مٹتی مقامیت کو نہایت دل آویز شکل میں محفوظ کر لیا ہے۔"(۶)

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

اختر رضا سلیمی کے اس ناول میں ایک کردار دکھایا جاتا ہے جو ایک عرصہ پہلے گاؤں چھوڑ کر شہر میں مقیم ہو گیا تھا اور اب یہ کردار سال میں دو مرتبہ شہر سے گاؤں آتا ہے۔ وہ گاؤں میں کچھ وقت گزارتا ہے۔ اس سفر میں گاؤں آتے وقت اس کے بیوی بچے بھی ساتھ ہوتے ہیں جو گاؤں میں کبھی چند ہفتے ٹھہرتے ہیں اور کبھی چند دن تک۔ اس کردار کے بچے گاؤں آنے کا انتظار کرتے ہیں اور گاؤں کے ماحول کے مطابق اگر ان کا دل لگ جائے تو وہ یہاں قیام کرتے ہیں اور اگر موسم ماحول اچھا نہ ہو تو وہ چند دن میں ہی واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چند کردار ایسے بھی ہیں جو صرف گاؤں میں ہی رہتے ہیں اور گاؤں کی زندگی اور وہاں کی قدیم چیزوں سے محبت کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قدیم چیزیں گاؤں سے ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ ان چیزوں کو ٹوٹتا بکھرتا دیکھتے ہیں تو ان کے دل بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اس کردار اور اس کے گاؤں آنے کے نقشے کو عمدگی سے بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گاؤں کے حوالے سے کیا جذبات رکھتے ہیں۔

> ”وہ سال میں دو مرتبہ گاؤں آتا تھا۔ جون اور دسمبر میں جب اس کے بچوں کے سکول بند ہوتے اور وہ خود دفتر سے چند دنوں کی رخصت لے لیتا اور آب و ہوا تبدیل کرنے یہاں آ جاتا۔ گاؤں آنے سے پہلے وہ گاؤں کی مرکزی مسجد کے خادم کو اطلاع کر دیتا جو اس گھر کی، جس کے صحن میں اس کی ماں کی ڈولی اتری تھی اور جہاں اس نے بچپن کے دن گزارے تھے، صفائی ستھرائی کر دیتا تھا۔ گرمیوں میں تو وہ اٹھارہ بیس دن گاؤں میں گزارتا کہ معتدل موسم کے باعث اس کے بیوی بچے اپنا وقت یہاں ہنسی خوشی گزارنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے لیکن سردیوں میں وہ محض چار پانچ دن یہاں رُکتا کہ اس کے بیوی بچے یہاں کی شدید سردی زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتے۔“(۷)

اس ناول کا مرکزی کردار یہ سب کچھ سوچ رہا ہے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ مرنے والا ہے۔ وہ گزشتہ پینتالیس دنوں سے ایک عجیب و غریب تجربے سے گزر رہا ہے کہ اسے ہر لمحہ موت کا خوف رہتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت مر جائے گا۔ وہ مر گیا تو اس کے بیٹے تک اطلاع پہنچے گی وہ گھبرا جائے گا۔ شاید وہ اس وقت دفتر میں کسی ضروری میٹنگ میں بیٹھا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اس کے کسی ذاتی سٹاف میں سے کوئی اسے اطلاع دے اور اسے میٹنگ سے اٹھ کر آنا پڑے۔ وہ موت کی خبر سن کر سکتے میں آ جائے گا۔ یہ اس لیے نہیں کہ اسے باپ کے مرنے کا غم ہے بلکہ اس لیے کہ اسے کفن دفن کے لیے گاؤں جانا پڑے گا۔ وہ اپنی بیوی کو فون کرے گا تو یہ خبر سن کر اس کی تیوری چڑھ جائے گی کہ ابھی دو ماہ پہلے تو وہ لوگ گاؤں سے ہو کر آئے تھے اور پھر جانے آنے اور میت کو دفنانے کے اخراجات اس کے بھی علاوہ بچوں کی اسکول سے چھٹی کروانی پڑے گی۔ یہ الگ ایک بڑا مسئلہ ہے کہ ان کے امتحانات سر پر ہیں۔ اس چھٹی کے ان کے امتحانات پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ اختر رضا سلیمی اس عورت کے گاؤں کی عورتوں کے حوالے سے محسوسات کی ترجمانی یوں کرتے ہیں:

> ”اس کی بیوی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ گاؤں کی وہ عورتیں ہوں گی جن سے ملتے ہوئے اسے ہمیشہ گھن آتی ہے۔ لیکن اب تو اسے ان سے بغل گیر ہو کر باقاعدہ بین بھی کرنے ہوں گے اور ان کے جسموں سے آنے والی پسینے، گوبر اور نسوار کی بساند، اسے کئی دن سکھ چین سے سونے نہیں دے گے۔“(۸)

اس کے بیٹے کے بیوی بچے گاؤں آ کر انسانوں سے زیادہ پڑوسیوں کے جانوروں سے گھل مل جاتے ہیں۔ انہیں بلی، بکری اور گائے اچھی لگتی ہے۔ اس کے بیٹے کو کئی روز تک گاؤں رہنا پڑے گا اور تعزیت کے لیے آنے والوں سے رسماً بات بھی کرنا پڑے گی اور باپ کے بارے میں بھی پوچھیں گے تو اسے اپنے باپ سے رسماً محبت کا اظہار بھی کرنا پڑے گا۔ موت کہاں، کس وجہ سے ہوئی یہ بات بھی موضوعِ بحث رہے گی۔ گاؤں اور شہر کا موازنہ بھی ہو گا۔ یہاں اس کردار کی موت ایک تہذیب کی موت ہے۔ اس کردار کی زندگی خالص اور سادہ ماحول میں بسر ہوئی جہاں ٹیکنالوجی نہیں تھی۔ مشینی تہذیب کے آنے سے فطرت کو نقصان پہنچا ہے کہ درخت، دریا، پہاڑ، ندیاں، جھرنے، یہ سب اپنے اپنے انداز سے گاؤں میں روایات تھیں، اقدار تھیں، لوگ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ مشینی تہذیب نے گاؤں کی اس سادگی فطری ماحول کو ختم کر دیا ہے۔ اس ناول میں اس تہذیب کے مٹنے کا غم ہے، ایک نوحہ ہے، ایک تہذیب کی موت ہے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

اختر رضا سلیمی نے اس ناول "جندر" میں ہزارہ کے ایک گاؤں کی زندگی کو دکھایا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی میں آئے روز کوئی نہ کوئی حادثہ یا کوئی جھگڑا بپا ہوتا ہے۔ بیساکھی کے میلے کا آغاز ہوا چاہتا ہے اور سارا گاؤں اکٹھا ہوتا ہے۔ کسی کو دوسرے پر اور دوسرے کو تیسرے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہاں آرٹ کی پیشکش پر زور دیا گیا ہے۔ چیزیں کس طرح سے وقوع پذیر ہو رہی ہیں، یہ بات اہم ہے وہ گاؤں کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ قاری واقعہ کے حصار میں رہتا ہے اور یوں ناول کا ماحول، کردار اور زبان قاری کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جو دنیا ہمارے اندر ہے۔ اس کا جواب بھی ہمیں ناول میں ہی مل جاتا ہے۔ گاؤں کو چھوڑ کر جانے والے ایک طرح سے اس ساری زندگی کو چھوڑ کر جاتے ہیں۔

ناول میں ماضی کا وہ وقت دکھایا گیا ہے جب انسان اجتماعی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس معاشرے میں جتنے بھی لوگ تھے وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور ان کے کام اور کردار بھی سادہ اور اسی ماحول میں رچے بسے تھے۔ مثلاً اس گاؤں میں اگر ایک آدمی کا پیشہ کاشتکاری ہے تو وہ سارا دن سارا سال محنت کرتا ہے اور فصل اگاتا ہے۔ اسے ہل چاہیے تو وہ لوہار اور ترکھان مل کر بناتے ہیں۔ اس کے گھر میں برتن کمہار بناتا اور پہنچاتا ہے۔ ماشکی چھڑکاؤ کرتا ہے۔ حجام اس کے گھر پر آ کر حجامت بنا جاتا ہے۔ غرض جتنے بھی کام ہیں اتنے ہی لوگ ہیں۔ جب کسان کے گھر فصل پک کر آتی ہے تو وہ ان سب کو اس میں سے حصہ دیتا ہے۔ یہ تھی وہ اجتماعیت جس نے ان کو ایک جگہ باندھ کر رکھا ہوا تھا۔

اس ناول کا مرکزی کردار اس ٹوٹتی ہوئی تہذیب کے عمل کو روکنا چاہتا ہے۔ وہ اس بکھراؤ کو دیکھ رہا ہے۔ گاؤں میں بکھراؤ کو روک نہیں سکتا۔ اسے جندر یعنی چکی کی آواز پسند ہے مگر کام نہ ہونے کی وجہ سے اب لوگ اس کی طرف کم آتے ہیں۔ اسے جندر کی آواز سے عشق ہے۔ اگر وہ اسے نہ سنے تو اسے نیند نہیں آتی۔ وہ اس ماحول کو ختم نہیں ہونے دینا چاہتا کیونکہ اس نے اسی میں زندگی گزاری ہے۔ دیہات کو ٹوٹتے ہوئے دیکھنا اسے پسند نہیں۔ اسے مرنے کا خوف نہیں ہے اسے اس تہذیب کے مرنے کا خوف ہے جس میں اس نے زندگی بسر کی تھی جو اس کی سانسوں میں رواں ہے۔ وہ اس تہذیب کو کیسے گنوا سکتا ہے۔ اس ناول میں جگہ جگہ گاؤں کی اس تہذیب کا ذکر ہے جو مٹتی جا رہی ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

> "بہتی ندی کے دوسری جانب موجود اونچے ٹیلے سے جس پر کھڑے ہو کر گاؤں والے عموماً مجھے گاؤں میں ہونے والے کسی واقعے کی اطلاع ایک بلند آواز کی صورت میں دیا کرتے تھے، ٹکرا کر پلٹے گی اور اس کے کانوں میں گونجے گی تو وہ مزید خوف زدہ ہو جائے گا۔"(۹)

ناول کا مرکزی کردار موت کو بھی ساتھ ساتھ یاد کرتا ہے کیونکہ اسے اپنے مرنے سے زیادہ اس تہذیب کے مرنے کا دکھ ہے اور اس کا بیٹا جو گاؤں چھوڑ کر شہر میں آباد ہے، اس کے لوٹ کر آنے اور اس تہذیب کی طرف ناگواری کا اظہار کرنے پر افسوس ہوتا ہے۔ وہ ایسے سوالوں میں الجھا رہتا ہے کہ کیا موت بھی انسانوں کو انسانوں سے جدا کرتی ہے۔ کیا موت کے اندر انسان کا شعور ختم ہو جاتا ہے۔ موت انسانوں کو انسانوں سے دور لے جاتی ہے مگر کیا موت کیا انسان کے اندر سے اس کے ماضی کو ختم کر سکتی ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جو مرکزی کردار کے ذہن میں الجھاؤ پیدا کرتے ہیں اور پھر وہ اس ٹوٹتے ہوئے ماضی اور اس خوبصورت وقت کی کڑیوں کو یاد کرتا ہے جو اسے اس وقت میں لے جاتے ہیں جہاں اب صرف یادیں ہی یادیں ہیں۔ وہ اچھا وقت جو گزر گیا ہے، کیا اس کی یاد کے سہارے زندہ رہا جا سکتا ہے یا یہ خود کو فریب دینے جیسا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے خواب اور حقیقت کو ایک خوبصورت تناسب کے ساتھ اس طرح آپس میں ملا دیا ہے کہ ہم چاہیں بھی تو ان کو الگ پیش کر سکتے ایک اور خوبصورت منظر جو گاؤں کی زندگی کی خوبصورتی کو واضح کرتا ہے۔

> "ان دنوں گاؤں اور اس کے پیچھے موجود وسیع و عریض سرکاری جنگل کو قصبے سے ملانے والی سڑک نہیں بنی تھی اور جنگل سے قصبے تک جانے کے لیے یہی واحد راستہ ہوا کرتا تھا۔ یہ راستہ جو اب اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ یہاں سے گزرنے والا بمشکل اپنے کپڑوں کو جھاڑیوں میں الجھنے سے بچاتا ہے تب خاصا چوڑا ہوا کرتا تھا۔ سرکاری نقشے میں یہ اب بھی قصبے سے جنگل تک پورے گیارہ فٹ ہے۔"(۱۰)

مرکزی کردار کے ذہن میں یہ بات شک پیدا کرتی ہے کہ وہ جس ماحول اور تہذیب میں پیدا ہوا تھا اسی میں مر اکیوں نہیں۔ اگر وہ اسی ماحول میں مر جاتا تو لوگ اس کے والد کی طرح اس کا نماز جنازہ ادا کرتے اور دفن کر دیتے۔ مگر آج کے جدید عہد میں انسان کے پاس انسان کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس کے پاس مشینوں کے لیے وقت ہے مگر انسانوں کے لیے نہیں۔ انسان انسان کو ترستا اس دنیا سے چلا جاتا ہے اس کے پاس بیٹھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کی بات سننے والا کوئی نہیں ہے اس کے ساتھ مل کر چلنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے دل کی بات کس کو سنائے وہ اس گزرتے ہوئے وقت کو کہاں قید کرے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

عجیب بے بسی ہے کہ وہ اس تبدیلی کو نہیں روک سکتا۔ دیہاتوں کو شہروں میں بدلنے سے نہیں روک سکتا۔ وہ گاؤں کی خوبصورتی اور ماضی کے قصے جگہ جاگیر میں موجود ہیں جو قاری کو ماضی کے حسین سفر پر لے جاتا ہے جہاں نہ ٹیکنالوجی ہے نہ انسانِ نو کی مداخلت۔

"بابا جمال دین بتایا کرتا تھا کہ یہاں سے ہر ہفتے انگریز افسروں کو گزرتے ہوئے دکھا کرتا تھا جو کبھی کبھار ستانے کے لیے یہاں۔۔۔ جندر کے پچھواڑے موجود کاہو کے صدیوں پرانے درخت کے نیچے۔۔۔ رکا بھی کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ مقامی سپاہی تھے جو گھوڑوں کے پیچھے پیچھے پیدل چل رہے ہوتے تھے۔"(۱۱)

بابا جمال جنگل سے درخت کاٹنے کے واقعات سناتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت کہیں رک گیا ہے اور وہ کچی سڑک پر ان خچروں پر سوار اونگھ رہا ہے جن کے نعلوں پر اس نے چمڑا چڑھا رکھا ہے تاکہ چلتے ہوئے ان کے قدموں کی آواز سنائی نہ دے۔

ناول کا مرکزی کردار ولی خان ایک جندر میں کام کرتا ہے اور اس کی آواز اس کو بھلی لگتی ہے۔ وہ ماضی کو یاد کرتے ہوئے چیزوں اور آوازوں کو جندر کے ساتھ جوڑ دیتا ہے وہ جنگل سے گزرنے والے اونٹوں اور خچروں کے گلے کی گھنٹی کی آواز اور جندر کی آواز کے ملاپ سے پیدا ہونے والی اداسی کو محسوس کرتا ہے جس کی کوئی آواز نہیں ہوتی یہ اداسی چیزوں کے چلے جانے کی ہے گاؤں کے بکھر جانے کی ہے جندر کی آواز کے مدھم ہو جانے کی ہے۔ وہ ماضی اور دیہات کی خوبصورتی کے واقعات یوں سناتا ہے۔

"ان دنوں گاؤں والوں میں سے اکثر کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ کھیتی باڑی ہوتا تھا اور اگر کسی سال کوئی شخص کسی وجہ سے بوائی نہ کر سکتا تو اسے زمین سے بے وفائی کا طعنہ دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں وہ لوگ بھی جن کا ذریعہ معاش کچھ اور ہوتا سال میں دو مرتبہ اپنی زمین پر ہل ضرور چلاتے تھے۔"(۱۲)

جندر ناول میں جہاں ایک طرف گاؤں کی اجتماعی زندگی کی خوبصورتی کو دکھایا گیا ہے وہیں اس سے بیگانگی اور شہر کی زندگی کے ساتھ ایک موازنہ بھی سامنے آتا ہے۔ دیسی گھی، اصیل مرغے، فراغت، مہمان داری، لوگوں کا ساتھ مل کر بیٹھنا اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا گاؤں کی زندگی کی خوبصورتی کو ظاہر کرتا ہے۔ فصل کاٹنے کے حوالے سے گاؤں کا نقشہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

"فصلوں: خاص کر گندم کی کٹائی اور گاہی کے دنوں میں وہ لوگ بھی جو شہر میں نوکری یا کاروبار کر رہے ہوتے راتوں رات گاؤں آجاتے اور صبح سویرے درانتیاں اٹھائے لیتریوں میں شامل ہو جاتے۔ سب مل جل کر ایک دوسرے کی فصل کاٹتے، انہیں ڈھو کر مکانوں کے صحنوں اور کھلیانوں میں جمع کرتے اور پھر بیلوں کی جوڑی کے پیچھے کاہو کی خشک پھنکیں باندھ کر اسے گاہتے۔ مکئی کی کٹائی کے بعد گاؤں کی عورتیں مل کر اسے چھیلتیں اور پھر مرد راتوں کو بھاری سوٹے لے کر اسے کوٹتے اور ان کے دانے علیحدہ کرتے۔ شاید یہی مجبوریاں تھیں جو لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رہنے اور محبت کرنے پر اکسا لیتی تھیں۔"(۱۳)

اختر رضا سلیمی نے جندر میں گاؤں کی زندگی کی خوبصورتی اور میل جول کو دکھا کر اس زندگی کی ٹوٹ پھوٹ کو دکھایا ہے۔ مرکزی کردار جندر کے قیام کی دلچسپ اور عجیب کہانی سناتا ہے۔ جب جندر کو اس کے دادا نے قائم کیا وہ ایک پاٹ چوری ہو گیا تو راجہ کے ساتھ شرط لگی اور آخر میں راجہ شرط ہار گیا۔ وہ پھر اپنی موت کی طرف آتا ہے اور اپنے بیٹے کو یاد کرتا ہے جو شہر میں ہے۔

ناول کا یہ مرکزی کردار گاؤں کی زندگی سے اس قدر جڑا ہے کہ کسی بھی صورت اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ وہ شہر کو کسی صورت قبول نہیں کرتا۔

"جس طرح راجا کا انہیں جندر تعمیر کرنے کی اجازت دینا اختیاری تھا بے شک وہ اپنی شرط ہار چکا تھا۔ لیکن اگر وہ چاہتا تو اپنے وعدے سے پھر بھی سکتا تھا اور کوئی شخص اسے چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح میرا یہاں اس حالت میں مرنا بھی ایک طرح سے اختیار ہے اگر میں چاہتا تو شہر میں موجود اپنے بیٹے کی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

شاندار کوٹھی میں بھی مر سکتا تھا کہ وہ دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی کئی مرتبہ مجھے ساتھ لے جانے کی کوشش کر چکا ہے۔ایک آدھ مرتبہ تو اپنے ساتھ زبردستی لے بھی گیا تھا لیکن بیماری اور نقاہت کے باوجود وہاں ایک ہی رات بمشکل جاگ کر گزار پایا تھا اور اگلے ہی روز اسے بتائے بغیر واپس چلا آیا تھا۔"

(۱۴)

وہ عارضی طور پر شہر جانے اور وہاں رہنے کے عرصے کے گھٹن اور بیزاری سے تعبیر کرتا ہے۔وہ کسی بھی صورت یا باعث مجبوری شہر میں نہیں رہنا چاہتا۔شہر ایک طرح سے ان کی قید ہے جبکہ اس کے بیٹے کی صورت حال اس کے برعکس ہے۔وہ گاؤں آتا تو ہے مگر مجبوری سے وہ یہاں محض تفریح کے لیے آتا ہے اور یہاں رہنے کو وہ اپنی توہین سمجھتا ہے۔اس کے نزدیک گاؤں کی زندگی ایک رکی ہوئی کائی زدہ زندگی ہے اگر وہ یہاں رہا تو اسے بھی رنگ لگ جائے گا اور وہ تعصن کی وجہ سے مر جائے گا۔مرکزی کردار شہر میں گزرے ایک اور وقت کے حوالے سے یوں بیان کرتا ہے:

"جب سے وہ افسر بنا ہے اسے کئی لوگوں کی طرف سے طعنے مل رہے ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کچھ عرصہ پہلے جب مجھے دمہ کا شدید دورہ پڑا اور وہ مجھے یہاں سے شہر لے گیا تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا کہ اباڈاکٹر صاحب کو یہ نہ بتانا کہ آپ جندروئی ہیں۔میں اس کی پریشانی سمجھ گیا تھا اور میں گردن ہلا کر فوراً ہامی بھر لی تھی۔"(۱۵)

جندر کا مرکزی کردار جہاں گاؤں کی سادہ اور آسان زندگی کو پسند کرتا ہے وہیں ٹیکنالوجی اور ترقی کو ناپسند کرتا ہے۔اس کی گاؤں میں دوستی ایک بزرگ بابا جمال دین سے ہے جو قصہ گو ہے جو گاؤں میں ہر دل عزیز ہے اور اسے بچپن سے جنوں، پریوں، بادشاہوں، شہزادوں، دیوں، جنگلات، جانوروں اور حشرات کی کہانیاں سناتا ہے۔وہ اپنی موت کے حوالے سے ایک اور قیاس کرتے ہوئے ٹیلی فون کا ذکر یوں کرتا ہے:

"اگرچہ اب ہمارے گاؤں میں موبائل فون کی سہولت موجود ہے لیکن میں اسے کبھی اپنے زیر استعمال نہیں لایا کہ ایک تو مجھے کبھی ان چیزوں سے دلچسپی نہیں رہی اور دوسرا جندر والے مقام پر کسی کمپنی کے سگنل ہی نہیں آتے کہ اس کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں۔"(۱۶)

ناول جندر کا بڑا موضوع "دیہی ترک سکونت" ہے۔مرکزی کردار ولی خان کے بیٹے نے گاؤں چھوڑ دیا اور اب وہ صرف بہت ضروری موقع پر گاؤں آتا ہے وہ بھی محض چند دن کے لیے اور اس کا قیام یہاں بچوں کی تفریح کے لیے ہوتا ہے۔اس کا والد اس عمل سے اندر سے ٹوٹ چکا ہے۔ایک طرف اس کی اولاد ہے وہ اولاد کو کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اب اس نے اپنی زندگی پر جبر کیا ہوا ہے اور طے کیا ہوا ہے کہ وہ کبھی شہر نہیں جائے گا۔اسی دوران وہ اپنی موت کا تصور کرتا ہے کہ وہ مر جائے گا تو اس کے بیٹے کو مجبوراً گاؤں آنا پڑے گا اور یہ عمل اس کی بیوی کے لیے خاص طور پر ناگواری کا مزاج برہم رہے گا۔

جندر کا مرکزی کردار جو خود کو جندروئی کہلواتا ہے۔بیٹے کے دیہات چھوڑنے سے ایک خود ساختہ تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے اور مختلف چیزوں کو لے کر خوف زدہ ہوتا رہتا ہے۔موت کا خوف بھی اس پر اسی وجہ سے طاری ہے۔کبھی وہ جندر پر آنے والے لوگوں کا انتظار کرتا رہتا ہے تو کبھی اسے کوئی وہم آن گھیرتا ہے۔رات اور ندی کے خوف زدہ ہوتا ہے۔

"ایک جندروئی کے لیے رات سب سے محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے۔جوں جوں چیزیں اندھیرے میں اپنا وجود گم کرتی چلی جاتی ہیں ان سے چمٹا نا معلوم خوف بھی آہستہ آہستہ ان سے علیحدہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک طلسم لے لیتا ہے۔ندی کے بہاؤ پر ٹھہری رات کے طلسم سے صرف ایک جندروئی ہی آشنا ہو سکتا ہے۔رات کے وقت جندروئی کسی سے نہیں ڈرتا۔سوائے اپنی ذات کے اندھیرے کی چادر تنتے ہی سب چیزیں اس کی نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔اس پر اپنی ذات کے اسرار کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔"(۱۷)

ولی خان اس قدر تنہائی کا شکار ہو چکا ہے کہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر وقت چکی چلتی رہے وہ خاموشی سے گھبراتا ہے۔اس کا دل چاہتا ہے کہ کوئی ہر وقت اس کے پاس رہے۔وہ لوگوں کی راہ دیکھتا ہے اور فارغ وقت میں مطالعہ کرتا رہتا ہے۔جندر کی آواز اس کے لیے زندگی ہے اگر یہ آواز نہ آئے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

تو وہ سو بھی نہیں سکتا۔ یہ تنہائی، یہ اداسی اپنوں کے نہ ہونے کی ہے۔ اس کا بیٹا شہر جا کر افسر بن گیا ہے اور وہ یہاں اکیلا پڑا اس کی یاد کو دوسری چیزوں میں تلاش کرتا ہے۔

"میں نے ایک بڑی چونگ کھارے میں انڈیلی اور نماز پڑھنے لگا۔ نماز کے بعد میں نے جندر کے پچھواڑے جا کر پانی والا پستہ ذرا سا اوپر کھینچا تا کہ جندر کی رفتار دھیمی ہو جائے اور ایک ہی چونگ زیادہ دیر تک پستی رہے تا کہ میں سکون سے سوتا رہوں۔ واپس آ کر میں نے جندر کی رفتار اور کھارے میں پڑے ہوئے دانوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ میں کم از کم پانچ گھنٹے آرام سے سو سکتا ہوں۔"(۱۸)

مرکزی کردار ولی خان جندر پر رہنے کی وجہ سے اس کا اسیر ہو چکا ہے اور نفسیاتی طور پر جندر کا قیدی اسے اس کی آواز کے بغیر نیند نہیں آتی۔ یہی جندر اس کی ازدواجی زندگی میں رکاوٹ بنا وہ اپنی چچازاد سے شادی کر لے اپنے گاؤں والے گھر میں لے گیا مگر وہ وہاں صرف اٹھارہ دن ہی رہ سکے اسے نیند نہ آئی اور جب اس کی بیوی کو احساس ہوا تو وہ دونوں جندر پر آ گئے۔ یہاں چند ماہ وہ دونوں خوشی خوشی رہے مل کر کھانا بناتے اور مل کر جندر پر آٹا پیستے مگر اس کی بیوی بھانپ گئی کہ یہ جندر کا قیدی ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا وہ انہیں خرچہ بھیجتا رہا حتیٰ کہ شہر میں بیٹے کی نوکری لگ گئی۔

"تقریباً پچیس سال بعد: جس دن راحیل کو پہلی تنخواہ ملی۔ اس نے مجھے پیغام دے بھیجا کہ میں آئندہ اسے پیسے نہ بھیجوں۔ اب اسے ان کی ضرورت نہیں رہی۔ سو اس کے بعد میں نے اسے کبھی پیسے نہیں بھیجے۔ راحیل کی نوکری کے کچھ ہی عرصے بعد وہ سکول کی ملازمت سے قبل از وقت ہی سبکدوش ہوئی اور راحیل اسے اپنے ساتھ شہر لے گیا پھر وہ کبھی گاؤں واپس نہیں آئی۔ پانچ سال پہلے جب اس کی موت واقع ہوئی تو راحیل نے اس کی تدفین وہیں کرنے کا فیصلہ کیا اس کی وصیت کے مطابق مجھے بھی اطلاع دی گئی میں جنازے میں شریک ضرور ہوا لیکن تدفین کے بعد اسی شام واپس آ گیا۔"(۱۹)

ناول جوں جوں اختتام کی طرف بڑھتا ہے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ مرکزی کردار کی ساری خوشی اور محرومی اسی جندر سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ اس جندر کا اس حد تک اسیر ہو چکا ہے کہ اب اس کے خشک ہونے کے دن قریب آتے جا رہے ہیں تو اسے اپنی موت سامنے دکھائی دے رہی ہے۔

ناول کے آخری حصے میں ٹیکنالوجی کی آمد سے گاؤں میں آنے والی تبدیلی کی وجہ سے ان کی زندگیوں میں آنے والی تبدیلی کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ جو مل جل کر فصل کاٹتے تھے ٹریکٹر کے آنے سے ان کا اجتماع ختم ہو گیا۔ لوگ فصل پکنے پر مسجد میں جمع ہوتے اور کوئی بزرگ فصل کی کٹائی کا دن مقرر کرتا۔ فصل کی کٹائی، لوگوں کا اکٹھے ہونا، گھروں میں فصل سنبھالنے کی تیاری، لپائی، پوچا، جھاڑو، فصل کی کٹائی کے گیت سب کچھ اتنا خوبصورت تھا کہ ولی خان اس زندگی کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس گاؤں میں پہلی بغاوت مرکزی کردار کے ماموں نے کی۔

"میرا ماموں جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد اور گاؤں کا پہلا میٹرک پاس تھا واحد آدمی تھا جس نے ان رسموں سے خاموش بغاوت کی تھی۔ وہ اپنی تعلیم مکمل ہونے کے بعد شہر چلا گیا تھا اور وہیں اسے ایک سرکاری ادارے میں اچھی نوکری مل گئی تھی شروع شروع میں تو وہ بھی کٹائی کے موسم میں گاؤں آ جاتا لیکن رفتہ رفتہ وہ لیتری سے غیر حاضر رہنے لگا اور اپنی فصل دوسرے گاؤں سے مزدور منگوا کر کٹوانے لگا اور گاہوانے لگا۔ پھر اس نے اپنی زمین کسی کو ٹھیکے پر دے دی جو اس کے حصے کے دانے ہر حال شہر بھیج دیا کرتا تھا۔ جب وہ مرا تو اس کی قبر مجھے اور اس کے دو بیٹوں کو تنہا کھودنا پڑی تھی کہ گاؤں کا کوئی بھی آدمی اس کی قبر کھودنے نہیں آیا تھا تاہم جنازے میں پورا گاؤں شریک ہوا تھا۔"(۲۰)

گاؤں کے رسم ورواج سے جس نے بغاوت کی گاؤں والوں نے اس کی قبر نہیں کھودی۔ یعنی جو آدمی فصل کی کٹائی میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ دوسرے لوگ اس کی فصل کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور وہ فصل کھڑی کھڑی گل سڑ جاتی تھی۔ ناول کا مرکزی کردار بتاتا ہے کہ اس کے ماموں کے مرنے پر

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

اسلے برس گاؤں میں ٹریکٹر اور تھریشر آ گئے اور فصل مرکزی سڑک کے کنارے رکھی جانے لگی اور تھریشر سے گاہی جاتی۔ بیلوں کی جوڑی جو کام تین دن میں کرتی تھریشر نے چند گھنٹوں میں کر دیا۔ اسی طرح ٹریکٹر نے کمپنیوں کو گھنٹوں میں سیدھا کیا اور چند ہی برسوں میں گاؤں سے بیلوں کا خاتمہ ہو گیا۔ مرکزی کردار اب صرف جندر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

اس مرکزی کردار کے بیٹے راحیل نے گاؤں میں پہلی بجلی سے چلنے والی آٹا چکی لگوائی تو ہمیں یہاں دو طرح کے رویے ناول میں ابھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اس چکی کے لگنے پر خوش ہوئے تھے اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اسے قبول نہیں کر رہے اور انہیں اس چکی کے آٹے میں مزا نہیں آتا وہ اب بھی جندر پر آتے ہیں۔ اس کردار کی بیوی جو اسے شادی سے پہلے بہادر، مختلف اور ذہین انسان سمجھتی تھی شادی کے بعد اس کے برعکس سمجھنے لگی اور وہ اس بزدل اور مجبور آدمی کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی وجہ اس نے کسی سے نہیں بتائی۔ حتیٰ کہ اپنے بیٹے کو بھی۔ یہ کردار جندر کی آواز کا قیدی ہے لیکن وہ گاؤں کی زندگی سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اس کے جندر کے آس پاس کی زندگی تبدیل ہو رہی ہے حتیٰ کہ اتنی تبدیل ہو گئی ہے کہ وہ اپنے جندر کے ساتھ اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جو فاصلہ قائم ہوا وہ اس کے اور اس کے بیٹے کے درمیان بھی موجود رہا۔ ایک چھوٹی سی بات نے ان دونوں کے درمیان پہاڑ جیسے فاصلے قائم کر دیے اور جو بعد میں نفرت میں بدل گئے۔ بہت عام سی وجہ کہ اسے جندر کی آواز سنے بنا نیند نہیں آتی۔ اس کے بیٹے نے اسے اس فرسودہ چکی کو چھوڑنے کے لیے کئی بار اکسایا مگر ان کے درمیان تلخی بڑھتی چلی گئی۔

> "کچھ ماہ بعد جب وہ دوبارہ مجھے ملنے آیا تو اس کے رویے میں خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ اب کی بار اس کے لہجے میں ایک افسر بول رہا تھا اس نے کہا تھا کہ خدارا میری عزت کا خیال کریں۔ اب یہ سب چھوڑیں اور گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کریں۔ مجھے اس کے رویے سے بہت صدمہ پہنچا تھا اور وہ خوشی جو پچھلی ملاقات میں اس کی باتوں سے مجھے ملی تھی زائل ہو گئی تھی۔"(۲۱)

اختر رضا سلیمی کا ناول "جندر" دیہی ترک سکونت کے موضوع کو عمدگی سے پیش کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اگرچہ ساری عمر گاؤں میں ہی بسر کرتا ہے لیکن وہ اس کرب کو سب سے زیادہ محسوس کرتا ہے۔ اس کی بیوی اور بیٹا اسے چھوڑ کر شہر چلے گئے ہیں۔ وہ گاؤں میں رہتے ہوئے بھی گاؤں سے کٹ کر رہتا ہے۔ اسے اب لوگوں کی ضرورت ہے اسے خواب آتے ہیں۔ واہمے آتے ہیں۔ وہ شہر سے نفرت نہیں کرتا لیکن شہر نے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ وہ اب موت کا منتظر ہے اور موت کے بعد کے ان مناظر کو یاد کر رہا ہے جہاں محض اس کے سامنے چیزیں ہو رہی ہیں اس میں اس کی مرضی شامل نہیں ہے۔ وہ لوگوں کی نفرت کو محسوس کر رہا ہے۔ اس کے سامنے اس کا مان ٹوٹ رہا ہے۔ وہ محض تماشائی ہے۔ چیزیں ٹوٹ رہی ہیں، بکھر رہی ہیں اور وہ بے بس ہے۔

حوالہ جات

۱۔ طارق مجید، ڈاکٹر، "اردو ناول میں دیہی معاشرت"، (اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۲۲ء)، ص ۳۰

۲۔ ایضاً، ص ۶۰

۳۔ محمد یسٰین، ڈاکٹر، "ناول کا فن اور نظریہ"، (لاہور، کتاب سرائے، ۲۰۱۳ء)، ص ۱

۴۔ اختر رضا سلیمی، "مخاطبہ"، مشمولہ: "خواب اجتماعی لاشعور اور اختر رضا سلیمی"، (راولپنڈی، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ص ۱۳۲

۵۔ قاضی محمد احمد، "معاصرین کی آرا"، مشمولہ: "خواب اجتماعی لاشعور اور اختر رضا سلیمی"، (راولپنڈی، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ص ۱۴۶

۶۔ شاہد نواز، ڈاکٹر، "اکیسویں صدی کے اردو ناول میں مقامیت کی دل آویز تشکیل"، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات،، شمارہ: ۱۲۴، ۱۲۳، جنوری تا جون، مدیر: اختر رضا سلیمی، (اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۲۰ء)، ص ۱۵۲، ۱۵۱

۷۔ اختر رضا سلیمی، "جندر"، (اسلام آباد، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۲

۸۔ ایضاً، ص ۱۴

۹۔ ایضاً، ص ۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص۲۳
۱۱۔ ایضاً، ص۲۴
۱۲۔ ایضاً، ص۲۶
۱۳۔ ایضاً، ص۲۷
۱۴۔ ایضاً، ص۴۱
۱۵۔ ایضاً، ص۴۱
۱۶۔ ایضاً، ص۴۷
۱۷۔ ایضاً، ص۷۴
۱۸۔ ایضاً، ص۸۱
۱۹۔ ایضاً، ص۹۵
۲۰۔ ایضاً، ص۱۰۱
۲۱۔ ایضاً، ص۱۱۴